پس نوآبادیات: مشرق کی بازیافت کی تحریک

امتیاز عبدالقادر
ریسرچ اسکالر، کشمیر یونیورسٹی، سرینگر

POST COLONIALISM
A REVIVAL MOVEMENT OF ORIENT

Imteyaz Abdul Qadir
Research Scholar, Kashmir University, Srinagar

Abstract

Post colonial trend in literature begins with the resistance against colonial system. This trend got developed in one shape or other in the occupied countries with the start of resistance movement against colonialism. This resistance was all encompassing and could be felt on socio-political and literary levels. This movement is aimed at reversal of colonial system and revival of indigenous values side by side revivification of golden values of the past. There emerged great literary persons committed to this movement in almost all occupied countries and they caused a revolution like effect in the currents of their respective literature. This article focuses the Orient side of the said movement.

Keywords:

مغربی فلسفہ، عقلیت، پس نوآبادیات، ادبی، ثقافتی، ایشیا، افریقا، ڈیکارٹ، ٹیگور، کیب رال

بیسویں صدی جو اپنے آغاز میں عالم انسانیت کے لیے ہوش ربا چیلنج لے کر آئی تھی آخر ایسی قوتوں کے ظہور سے ہم کنار ہوئی جو اس چیلنج کا بخوبی سامنا کر کے دنیا کو نیا رُخ دے رہی تھیں۔ اس صدی میں مغرب نے مادیت کو ایک کابوس کی طرح عالم انسانیت پر مسلط کردیا تھا جو طرح طرح کے انسانیت دشمن فلسفوں کا سہارا لے رہی تھی۔ پہلی جنگ عظیم میں مغرب کی استعماری ہوس کے بدترین مظاہر، پھر اشتراکیت کا عروج اور بے شمار انسانوں کا قتل، ہٹلر و مسولینی کا فروغ اور جاپان کے خلاف پہلی بار ایٹم بم کا وحشیانہ استعمال، غرض اس صدی کے نصف اول میں انسانیت کے سینے کو چھلنی کرڈالنے کی تمام کوششیں ان لوگوں نے کیں جو خود کو بے حد ترقی یافتہ سمجھتے تھے۔ پھر مغرب کی سیاسی قوت کی چٹانیں شکستہ ہوئیں۔ ایشیا و افریقہ کے ملکوں کو سیاسی آزادی حاصل ہوگئی، مگر مغرب کی ذہنی غلامی ختم نہ ہوئی۔ اب میدان جنگ مغرب نے بڑی حکمت سے مشرق کو بنانے کی کوشش کی، کوریا، نہر سویز اور ویتنام کی خون ریز جنگیں ہوئیں اور انسانیت مسلسل ہلاکت اور بربادی کے خطرات سے دوچار رہی۔ انسانیت کو اس خوف ناک موڑ تک لانے والے افکار ونظریات کا ایک سرسری جائزہ مناسب ہوگا۔

مغربی فلسفہ اور مغربی سائنس دونوں نے جب سفر شروع کیا تو اگرچہ اُن کا رُخ خدا پرستی کے بالکل مخالف سمت میں تھا تاہم چوں کہ وہ مذہبی ماحول میں گھرے ہوئے تھے اس لیے وہ ابتداءً نیچریت (Naturalism) کو خدا پرستی کے ساتھ ساتھ نباہتے رہے۔ مگر جوں جوں وہ آگے بڑھتے گئے، نیچریت خدا پرستی پر غالب آتی چلی گئی، حتیٰ کہ خدا کا تخیل اور خدا کے ساتھ ہر اُس چیز کا تخیل جو عالم طبیعی سے بالاتر ہو، اُن سے بالکل غائب ہوگیا اور وہ اس انتہا پر پہنچ گئے کہ مادۂ حرکت کے سوا کوئی شے اُن کے نزدیک حقیقی نہ رہی۔ سائنس، نیچریت کا ہم معنی قرار پاگئی اور اہل حکمت وفلسفہ کا ایمان اس نظریہ پر قائم ہوگیا کہ ہر چیز جو ناپی اور تولی نہ جاسکے اس کی کوئی حقیقت ہی نہیں ہے۔(۱)

ڈیکارٹ (1650ء) مغربی فلسفہ کا آدم سمجھا جاتا ہے، ایک طرف تو خدا کا زبردست

قائل ہے اور مادّہ کے ساتھ روح کا مستقل وجود بھی مانتا ہے، مگر دوسری طرف وہی ہے جس نے عالم طبیعی کے آثار کی توجیہ میکانکی طریق پر کرنے کی ابتدا کی اور اس طریق فکر کی بنیا درکھی جو بعد میں سراسر مادہ پرستی (Materialism) بن گیا۔ ہابس (1679) اس سے ایک قدم اور آگے بڑھا کر فوق الطبیعت کی کھلم کھلا مخالفت کرتا ہے، نظام عالم اور اس کی ہر شے کو میکانکی توجیہ کے قابل قرار دیتا ہے۔ اسی زمانے میں Spinoza اٹھا، جو سترہویں صدی میں عقلیت (Rationalism) کا سب سے بڑا علم بردار تھا۔ اس نے مادّہ اور روح اور خدا کے درمیان کوئی فرق نہ رکھا، خدا اور کائنات کو ملا کر ایک کُل بنادیا اور اُس کل میں خدا کے اختیارِ مطلق کو تسلیم نہ کیا۔ لائبنز اور لاک (1716ء اور 1704ء) خدا کے قائل تھے، مگر دونوں کا میلان نیچریت کی جانب تھا۔(۲)

یہ سترہویں صدی کا فلسفہ تھا جس میں خدا پرستی اور نیچریت دونوں ساتھ ساتھ چل رہی تھیں۔ اسی طرح سائنس نے بھی سترہویں صدی تک کامل الحاد کا رنگ اختیار نہیں کیا۔ کوپرنکس، کپلر، گیلیلیو، نیوٹن اور سائنس کے دوسرے علم برداروں میں سے کوئی بھی خدا کا منکر نہ تھا لیکن وہ نیچریت اور خدا پرستی میں کوئی خطِ امتیاز نہ کھینچ سکے اور یہی سمجھتے رہے کہ دونوں ایک ساتھ نبھ سکتے ہیں۔

اٹھارہویں صدی میں یہ حقیقت نمایاں ہوگئی کہ جو طریق فکر خدا کی ہستی کو نظر انداز کر کے نظامِ کائنات کی جستجو کرے گا، وہ مادّیت، بے دینی اور الحاد تک پہنچے بغیر نہ رہ سکے گا۔ اس صدی میں جان ٹولینڈ، ڈیوڈ ہارٹلے، ہولباخ، روسو اور ایسے ہی دوسرے آزاد خیال فلاسفہ وحکما پیدا ہوئے جنھوں نے اعلانیہ الحاد کی راہ اختیار کی۔ انیسویں صدی میں مادیت اپنے کمال کو پہنچ گئی۔ فوکت، بوخز، کومت (Comte)، موبثات اور دوسرے فلاسفہ وحکما نے مادّہ اور اس کے خواص کے سوا ہر شے کے وجود کو باطل قرار دیا۔ یہی وہ فلسفہ اور سائنس ہے جس نے مغربی تہذیب کو پیدا کیا۔ بقول مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ:

"اس کو بدقسمتی کے سوا اور کیا کہیے کہ جس صدی میں یہ نئی تہذیب اپنی مادہ پرستی، الحاد اور دہریت کی انتہا کو پہنچی ٹھیک وہی صدی تھی جس میں مراکش سے لے کر مشرق اقصیٰ تمام اسلامی

ممالک مغربی قوموں کے سیاسی اقتدار اور حاکمانہ استیلاء سے مغلوب ہوئے۔ مسلمانوں پر مغربی تلوار اور قلم دونوں کا حملہ ایک ساتھ ہوا۔ جو دماغ مغربی طاقتوں کے سیاسی غلبہ سے مرعوب اور دہشت زدہ ہو چکے تھے، ان کے لیے مشکل ہو گیا کہ مغرب کے فلسفہ و سائنس اور ان کی پروردہ تہذیب کے رعب وداب سے محفوظ رہتے۔ خصوصیت کے ساتھ ان مسلمان قوموں کی حالت اور بھی زیادہ نازک تھی جو براہ راست کسی مغربی سلطنت کے زیرِ حکم آگئی تھیں۔ ان کو اپنی دنیاوی مفاد کی حفاظت کے لیے مجبوراً مغربی علوم حاصل کرنے پڑے اور چوں کہ یہ تحصیل علم خالص تحصیل علم کی خاطر نہ تھا بل کہ ایک مرعوب ذہنیت کے ساتھ مغربی استادوں کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا گیا تھا، اس لیے مسلمانوں کی نئی نسلوں نے شدت کے ساتھ مغربی افکار اور سائنٹفک نظریات کا اثر قبول کیا۔ ان کی ذہنیتیں مغربی سانچے میں ڈھلتی چلی گئیں۔ ان کے دلوں میں مغربی تہذیب کا نفوذ بڑھتا چلا گیا.....''(۳)

غرض خیالات پر خیالات اور نظریات پر نظریات سامنے آتے رہے۔ مغرب نے اسے مایہ ناز سمجھا کہ اپنے خیالات وافکار کو ہر آن تبدیل کرتا رہے، جو چیز پرانی ہو گئی اسے چھوڑ کر نئے رجحانات اور تصورات کا سہارا لے۔ ان کے نزدیک یہ حقیقی ارتقا اور انسانی ذہن وفکر کے نشو ونما کی علامت ہے۔ برعکس اس کے ہندوستانی تہذیب ایسے انسان پر بھروسا کرنے سے منع کرتی ہے جو اپنے خیالات ہر آن بدل رہا ہو، جو صداقت کو مستقل بالذات شے نہ سمجھتا ہو۔ بقول حسن عسکری:

''جو شئے مستقل بالذات نہ ہو اسے صداقت کیوں کر کہا جا سکتا ہے''۔(۴)

پس نوآبادیاتی ادب اور تنقید کا آغاز نوآبادیاتی تسلط کے دوران میں اور بعد ازاں اس کے خلاف مزاحمت کے رویوں اور طریقوں سے ہوتا ہے۔ مطلب یہ کہ پس نوآبادیاتی رجحان کسی نہ کسی صورت میں اسی وقت سے شروع ہوا جب غلام ملکوں نے نوآبادیاتی نظام کے خلاف مزاحمتی تحریکیں شروع کیں۔ یہ رجحان تاریخی، سیاسی، تہذیبی اور ادبی سطح پر تقریباً ایک ساتھ ہی شروع

ہوااوراس کے تحت وہ تمام ممالک آتے ہیں جو تیسری دنیا کے نام سے جانے جاتے ہیں۔پس نوآبادیات کا بنیادی مقصد نہ صرف تہذیبی اور سیاسی سطح پر نوآبادیاتی نظام کو اُلٹ دینا ہے اوراس کی جگہ مقامی و ذیلی تہذیبی قدروں کا احیا ہے بل کہ اپنے ماضی کی شان دار قدروں کی بازیافت ہے۔

ایڈورڈ سعید (Edward Said) اور دوسرے مفکرین نے اس کی ضرورت کو محسوس کیا اور ایسا مانا جاتا ہے کہ نوآبادیات کی شروعات کی مشہور کتاب **Orientalism** سے ہوئی۔اس کتاب میں انھوں نے نوآبادیاتی اندازِ فکر کو زیادہ مربوط اور منضبط انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی۔سعید(۵) کا ماننا ہے کہ علمی، ادبی، ثقافتی اور فنی ترقیوں کے پیچھے حکم راں قوم کی اپنی غرض و غایت ہوتی ہے اور اپنی قوت کو مستحکم کرنے کے لیے وہ علمی میدان میں بھی ایسی ہی صورت پیدا کرتے ہیں جو ان کی حکم رانی کو مزید استحکام بخشے۔

پس نوآبادیات ایک علمی، عقلی اور نظریاتی نظریہ ہے جو ہندوستان آزاد ہونے کے بعد ابھر کر سامنے آیا۔جو تحریک ایشیا، افریقہ اور جنوبی امریکہ میں چل رہی تھی ، جو رہنما نوآبادیات کے خلاف تھے مثلاً گاندھی، ٹیگور، سیسیر، سینگھور، کیب رال، فینن وغیرہ ان کی تحریک نے لوگوں میں انقلاب پیدا کیا اور یہ نظریہ وجود میں آیا۔(۶) پرمود کے نیر رقم طراز ہیں(۷):

> "Post-colonoialism is academic, intellectual, ideological and ideational scaffolding of the condition of decolonization (The period following political independence for nation and culture in Africa, Asia & South America). Post Colonialism as a theory and a critique emerged from within anti-colonial activism & political movements in Asia, Africa & South America. Intellectuals & political leaders among natives.....Gandhi, Cesaire, Tagore, Senghor,Cabral, Fanan were anti colonial activist thinkers whose political views metamorphosed into political & literary cultural theory".

1947ء میں ہندوستان اور 1962ء میں افریقہ کے آزاد ہونے کے بعد *Gramsci*

اورفو کو نے پس نوآبادیات امور پر توجہ کی تھی لیکن سعید کے گہرے تجزیے کے بعد کچھ بہتر نتائج سامنے آئے، جو بے حد دوررس ثابت ہوئے۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو پس نوآبادیات اس نظریے کا نام ہے جس کے تحت یہ بات ذہن نشین کرائی جاتی ہے کہ ہمیں اپنی تہذیب وثقافت اور قدیم چیزوں کو منظر عام پر لانا چاہیے نہ کہ اس پر پردہ ڈالنا چاہیے۔

انیسویں صدی کے نصف آخر کو اردو کے شعر وادب کی نظریہ سازی کے ضمن میں بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ 1857ء کے بعد کے زمانے میں اردو تنقید تذکرہ نویسی کے دور سے باہر نکلی۔ اسی زمانے میں اردو کے کلاسیکی ادبی سرمایے کے مربوط اور مبسوط جائزے کا سلسلہ شروع ہوا، اور اسی دور میں مغرب کے بعض ادبی نظریات اور تنقیدی رویوں کو عالمی اصول ومعیار کی حیثیت حاصل ہوئی۔ پروفیسر ابوالکلام قاسمی اس تناظر میں لکھتے ہیں:

> ''اس انداز فکر کے اثرات ہمہ گیر اور دوررس ثابت ہوئے کہ تقریباً سوسال تک اردو کے نظریۂ شعروادب میں مغربی فکر واحد تفہیمی طریق کار کے طور پر استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ نتیجے کے طور پر کسی نے اردو کی شعری اصناف میں زوال آمادگی کے عناصر تلاش کیے، کسی نے قصیدہ، مثنوی اور مرثیہ کو از کار رفتہ قرار دیا، کسی نے ہماری شاعری کی سب سے توانا اور مستحکم صنف غزل کو مغربی نظم گوئی کے پیمانوں پر پرکھنے کی کوشش کی، کسی نے اردو شاعری کے بڑے حصے کو جاگیردارانہ معاشرے کی عکاسی کا نام دیا، کسی نے شاعری کو محض سماجی اظہار کے طور پر دیکھنے کا انداز اختیار کیا اور اس کے ردعمل میں دوسرے حلقے نے ادب میں جنسی اور نفسیاتی محرکات کی اہمیت منوانے کی کوشش کی.....''(۸)

علاوہ ازیں اردو ادب کے بیشتر تنقید نگار اسی تنقید سے متاثر رہے جس کی شروعات حالی اور شبلی نے کی تھی۔ انگریزی پڑھنے کے ساتھ ساتھ تنقید میں انگریزیت بھی بڑھتی رہی۔(۹)

عبدالقادر سروری اولین تنقید نگاروں کے بعد دوسرے عہد کے تنقید نگاروں میں اہم مقام رکھتے ہیں، جن کی تنقید میں مغرب کا بہت زیادہ اثر دکھائی دیتا ہے۔انھوں نے شعروادب کے متعلق بحث کرتے ہوئے ارسطو، افلاطون اور میتھو آرنلڈ کے خیالات کو پیش کیا ہے۔مزید برآں انھوں نے اردوادب میں کچھ ایسے مباحث کو شامل کیا جو اس سے قبل اردوادب میں نہیں تھے مثلاً سائنس اور شاعری کی بحث یا رزمیہ اور شاعری کے اقسام پر اظہار خیال۔ادب میں جدّت عیب نہیں بل کہ حُسن تصور کیا جاتا ہے اور لچکیلا پن اس کا لازمہ ہے لیکن بقول عبادت بریلوی:

''ان سب میں پروفیسر سروریؔ کے اپنے خیالات کم ہیں اور دوسرے کے خیالات زیادہ ہیں''۔(۱۰)

تنقید کے مغربی اصول وضوابط اور شعری تدابیر نے اردو میں ادبی تفہیم اور تعینِ قدر کو یقینی طور پر نئی بلندیوں سے آشنا کیا۔مگر افکارونظریات کی ہماہمی میں اس بات سے یکسر صرف نظر کیا گیا کہ ادب کے کون سے نظریات ایسے تھے جو ہماری اپنی تہذیب وثقافت سے اخذ کیے گئے تھے اور ان نظریات میں کون سے ایسے عناصر شامل ہوئے جن کا ہماری ثقافتی قدروں سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔(۱۱) مرورزمانہ کے ساتھ ساتھ اردوادب کے ماہرین وناقدین کو یہ احساس ہوا کہ اس قدر مغرب کی پیروی مشرقی تہذیب وثقافت، علوم وافکار اور روایات کے لیے سم قاتل ثابت ہوگی۔اپنی چیزوں پر نقطہ چینی اور انھیں کم تر سمجھنا اپنی تہذیب وتمدن اور ثقافت سے انکار کے مترادف ہے۔اس احساس کا نقش اولیں ہمیں سرسیّد کے یہاں ملتا ہے، اگر چہ ہندوستانی تہذیب اور اردو ادب کی تاریخ کے سیاق وسباق میں سرسیّد اور ان کے معاصرین کے لیے برطانوی کوششیں غیر معمولی طور پر اطمینان قلب کا باعث تھیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جس تہذیب وثقافت اور مشرقی روایات کو بچانے کی بات آج ہورہی ہے اردو میں سرسیّد نے ہی اس کی شروعات کی تھی۔سرسیّد نے غازی پور میں سائنٹفک سوسائٹی قائم کی تاکہ انگریزی اور دوسرے علوم کی کتابوں کے علاوہ اسلامی تاریخ کو عربی سے اردو میں ترجمہ کیا جائے۔(۱۲) بعدازاں عبدالرحمٰن بجنوری نے

اس کام کو جلا بخشی ۔وہ یورپ کی کئی زبانیں جانتے تھے،حصول تعلیم کے لیے مغرب کا بھی رُخ کیا لیکن ان پر مغربی تنقید و ادب دوسرے طریقے سے اثر انداز ہوئے ۔وہ اپنی روایات کو کم تر بتانے کے بجائے بہتر بتاتے تھے۔انھوں نے اپنے مقالہ 'محاسن کلام غالب' میں غالب کا مقابلہ مشرق و مغرب کے مختلف شاعروں اور ادیبوں سے کیا ہے اور اندازہ ہوتا ہے بجنوری، غالب کو ان سب پر فوقیت دیتے ہیں۔

پس نوآبادیات ایک نہایت جامع اور پیچیدہ تصور اور تنقیدی طریقہ کار کی حیثیت سے پس ساختیات اور مابعد جدیدیت کی تھیوریز میں تقریباً 1990ء کے آس پاس شامل ہوگیا۔اس کی رُو سے اُس مغربی فکر و تہذیب کا بطلان کرنا تھا، جس کی تشکیل میں ارسطو، ڈیکارٹ، کانٹ، ہیگل، مارکس یا پھر ہیومر، دانتے، کولرج اور ٹی۔ایس۔ایلیٹ کی تحریروں کا نمایاں حصّہ تھا اور جو ایک وحدانی تصور کی حیثیت سے ایک آفاقی اور عالم گیر شکل اختیار کر چکا تھا۔پس نوآبادیاتی ادب اور تہذیب کسی بھی وحدانی فکر کے بالکل خلاف ہے کیوں کہ اس سے ادب اور دوسری سرگرمیوں میں جنس، تہذیبی تشخص اور دوسرے چھوٹے چھوٹے مسائل دب جاتے ہیں اور اس کی جگہ *Imperialism* کا ڈسکورس حاوی ہو جاتا ہے۔

پس نوآبادیات کی ترویج و اشاعت میں سعید، ہومی بھابھا اور گائتری نے اہم رول ادا کیا۔سعید کے مطابق پس نوآبادیات و مابعد جدیدیت ایک دوسرے سے متعلق ہیں، وہ لکھتے ہیں:

> "Both post-colonialism and post modernism emerged as related topics and investigation during the 1980's and in many instances, seemed to take account of such works as Orientalism as antecedents..."(۱۳)

1984ء میں *Sociology of Literature* پر ایک کانفرنس منعقد ہوئی۔جس میں سعید، بھابھا اور گائتری نے بھی شرکت کی ۔بھابھا نے جو مقالہ پیش کیا وہ نفسیات سے لے کر

ردِتشکیل اورمابعد جدیدیت کی تھیوری پرمحیط تھا۔بھابھانے سیاہ اورسفید کی بحث اٹھائی اورسیاہ پرسفید کی بالادستی کے سارے عناصر کوزیربحث لایاجب کہ گائتری چودھری نے تانیثیت اورثقافتی مطالعے کے ذریعے مابعدجدیدساختیات ردتشکیل ،مارکسی نقطہ نظر اورنفسیاتی گرہ کشائی پر کھل کر بحث کی۔دوسرے شرکا نے بھی بڑھ چڑھ کر سیمی نار میں حصہ لیا اورنوآبادیات وپس نوآبادیات کے مسائل اوراس کے اثرات کی کھل کرنشان دہی کی تب سے ہنوز یہ سلسلہ جاری ہے اوراردو ادب میں بھی اس جہت سے بحث چل رہی ہے۔(۱۴)

ایڈورڈسعید مابعد ساختیات کےعلم برداروں کے سائے میں اپنے ذہن ودماغ کی آرائش کرتا رہاہے،خصوصاً اس پر دریدا اورفوکو کے اثرات تلاش کیے جاتے ہیں۔اگر کہیں بھی سیکولر تنقید کی گفت گو ہوگی تو اس باب میں سعیدکانام ناگزیرہوگا۔اس نے مشرق ومغرب کے ایسے مباحث سامنے لائے جن سے مغرب کی بالادستی اورتشدد کے کتنے ہی پہلو سامنے آتے ہیں۔سعیدکا خیال درست ہے کہ یورپی اورامریکی فن کاروں کےمشرقی مطالعات دراصل مشرق کے استحصال پرمبنی ہیں اورمغربی افکاروآراہی مشرقی فکرکوسمجھنے اوردیکھنے کی عقبی زمین ہے۔یعنی سعیدکے ذہن میں یہ بات بہت صاف ہے کہ کس طرح مغربی طاقتیں مشرقی قدروں کوکم تر باورکرکے اپنااحساس برتری قائم رکھنے کی کوشش میں مشغول نظرآتی ہیں۔مغربیوں کے یہاں مشرقیوں کے لیے جوکچھ بھی ہےوہ اس خیال پرمبنی ہے کہ ہرحال میں مشرق،مغرب کے مقابلے میں ایک ایسی صورت ہے جسے ترقی پذیر ہوناباقی ہے اوریہ ترقی پذیری دراصل مغربی راستے ہی سے ممکن ہے۔ذہن کی یہ بالادستی مشرق کے مطالعات پرحدودقائم کردیتی ہے اورنتیجے میں مشرق کی ایک ایسی شکل ابھرتی ہے جوکسی حال میں بھی مغرب کے سامنے کوئی چیلنج پیش نہیں کرسکتی۔(۱۵)

واضح ہوا کہ پس نوآبادیاتی مطالعہ اس امرپردال ہے کہ بیرونی حکومتیں نہ صرف یہ کہ دور حکم رانی میں ذہن ودماغ کومتاثرکرتی ہیں بل کہ حکم رانی کے خاتمے کے بعد بہت سارے ایسے دیرپااثرات چھوڑجاتی ہیں جن سے نکلنا مشکل ہوتاہے، پھرنسلی امتیازات کی جولکیریں واضح

طور نظر آتی ہیں اُس کی بھی وجہ یہ ہے کہ ذہن و دماغ آج تک اس فرق کو مٹانے کے لیے تیار نہیں ہے کہ جو سفید ہیں وہ سیاہ کے مقابلے میں اہم تر ہیں۔ پروفیسر وہاب اشرفی لکھتے ہیں:

''ہندوستان کے تناظر میں انگریزوں کی خدمات پر نگاہ ڈالی جائے تو بالائی سطح پر یہی کہا جائے گا کہ انگریزوں نے بہت سارے معاملات میں ہماری آنکھیں کھول دیں، نئے علوم کے دروازے وا کیے، نئی زندگی کے اسباق سکھائے، نئے ولولے سے ہم کنار کیا۔ ممکن ہے یہ بات جزوی طور پر درست ہو لیکن کیا اس امر سے انکار کیا جا سکتا ہے کہ آزادی کے اتنے عرصے بعد ذہنی غلامی کا طوق ہم اپنی گردن سے نکال کر پھینک نہ سکے اور احساس کم تری کا جو انداز رہا وہ آج بھی اسی طرح قائم ہے بل کہ ایسے رجحانات کو تقویت مل رہی ہے''۔(۱۶)

لیکن اب پس نو آبادیات کی پوری بحث مابعد جدیدیت کے حوالے سے ہی ممکن ہے۔ آنیا لونبا نے اپنی کتاب میں لکھا:

> ''Arif Drilik نے نو آبادیات کو مابعد جدیدیت سے ہم رشتہ کیا ہے، نہ صرف یہ کہ مابعد جدیدیت کا تاریخ اور ثقافت کے نئے احساسات کے تحت جنم ہوا ہے بلکہ یہ تیسری دنیا کی ثقافتی صورت کی وجہ سے وجود پزیر ہوئی ہے.... ''تین دنیا کی تھیوری' ایک مابعد جدید نقطہ نظر رکھتی ہے اور یہ ریڈیکل مارکسزم سے ٹکراتی ہے''۔(۱۷)

عالمی سطح پر دیکھا جائے تو تیسری دنیا یا پچھڑے ہوئے ایشیائی، افریقی، لاطینی امریکی، یا وسط ایشائی مما لک جن میں ہندوستان بھی ہے، ان سب کی حیثیت موجودہ دور سے پہلے انسانی سماج کے 'دوسرے' یعنی Other کی تھی، ان کی ثقافت، ان کے ادبی ڈسکورس اور ان کے تشخص پر توجہ مابعد جدیدیت دور کا کارنامہ ہے۔(۱۸)

دیوندر اسر لکھتے ہیں:

''.....مابعد جدیدیت جو جرمنی میں نطشے، ہسرل اور ہائیڈگر سے شروع ہوئی، فرانس میں

لیونار، مشل فوکو، رولاں بارتھ، ژاں بودریلا اور دریدا سے ہوتے ہوئے پال دیمان کے ساتھ سفر کرتی امریکی جامعات میں داخل ہوگئی اور پھر .... مشرق کے ممالک میں بھی بحث کا موضوع بن گئی .... تیسری دنیا کے ممالک میں مابعد جدیدیت نے گیٹ کریش کرنا شروع کر دیا تو ان ممالک کے دانش وروں میں ایک فکری انتشار کی صورت حال پیدا ہوگئی۔ کسی نے اس کا پر جوش استقبال کیا، دوسرے نے اس کی مذمت کی ..... بعض نے اسے نیا فیشن یا فیڈ کہہ کر نظر انداز کرنے کی کوشش کی تو بعض نے اسے نئی فکر کا رتبہ دے کر سنجیدگی سے اس کا مطالعہ اور محاسبہ کیا۔ کچھ نے اس کی ترمیم شدہ ورشن پیش کی تو کچھ نے اسے ہندوستانی حیثیت عطا کرنے کی کوشش کی اور پھر تمام الفاظ اور محاورات کبھی پرانے اور کبھی نئے ،اور کبھی بدلی ہوئی شکل میں استعمال میں لائے جانے لگے۔ مغرب، مشرق ،جدیدیت، روایت، گلوبلائزیشن، قومیت، نواستعماریت، پس نوآبادیت، نوسرمایہ پرستی.... اپنی پوری شدّت سے اور وسعت سے مابعد جدیدیت کے حوالے سے ادب، فن اور علم کے دوسرے شعبوں میں ظاہر ہونے لگے''۔(۱۹)

اکیسویں صدی میں اس مسئلے پر گفت گو ہونے لگی ہے۔ 1990ء یا 2000ء کے بعد کی شاعری یا فکشن میں پس نوآبادیات دکھائی دینے لگا ہے۔ لوگ اپنے وطن، اپنی ثقافت اور اپنی تہذیب کو پھر سے یاد کرنے لگے ہیں مثلاً اردو کے ایک مشہور شاعر منوررانا کے خیالات ملاحظہ ہوں:

> ''ضرورت اس بات کی ہے کہ اپنی شاعری میں بُش کے امریکہ کی جگہ ملی جلی آبادی والے اس گاؤں کا تذکرہ کریں، جہاں آج بھی ایک بیٹی کی رُخصتی کے درد کو پورا گاؤں محسوس کرتا ہے۔ گاؤں کے کسی بزرگ کے انتقال پر بیشتر گھروں کے چولھے سارا دن آگ کا انتظار کرتے رہتے ہیں''۔(۲۰)

اس کے علاوہ موجودہ دور کے تنقید نگاروں کو بھی اس بات کا اعتراف کرنا پڑا ہے کہ اردو ادب اپنے پرانے ورثے کو اہمیت دینے سے گریز کر رہا تھا۔ مغربی تصورات اور مغربی ادب سے واقفیت رکھنا اچھی بات ہے، ایک دوسرے سے استفادہ کرنا ہر ادب کی روایت رہی ہے۔ ادب،

ادب ہوتا ہے، اسے کسی زبان، ملک یا قوم کے دائرے میں قید نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن مغربی افکار کا اثر قبول کرنے کے ساتھ ساتھ کلاسیکی شعریات کو بھی اپنی تنقید میں شامل کرنا ضروری ہے۔ شمس الرحمان فاروقی رقم طراز ہیں:

''یہ سوال اٹھ سکتا ہے کہ کیا مغربی شعریات ہمارے کلاسیکی ادب کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے کافی نہیں؟ اس کا مختصر سا جواب یہ ہے کہ مغربی شعریات ہمارے کلام میں معاون ضرور ہوسکتی ہے بلکہ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ مغربی شعریات سے تعاون حاصل کرنا ہمارے لیے ناگزیر ہے لیکن یہ شعریات اکیلی ہمارے مقصد کے لیے کافی نہیں۔ اگر صرف اس شعریات کو استعمال کیا جائے تو ہم اپنی کلاسیکی ادبی میراث کا پورا حق ادا نہ کرسکیں گے اور اگر ہم ذرا بدقسمت ہوئے، یا عدم توازن کا شکار ہوئے تو مغربی شعریات کی روشنی میں جو نتائج ہم نکالیں گے وہ غلط، گمراہ اور بے انصافی پر مبنی ہوں گے۔''(۲۱)

اب ہمیں احساس ہونا چاہیے کہ ہم نے اپنی داستانوں اور مثنویوں کو غلط تناظر میں دیکھنے کی سعی کی ہے۔ انھیں سطحی اور رومانیت سے تعبیر کر کے اپنی ثقافتی جڑوں سے لاعلمی کا اظہار کیا ہے۔ لوک قصے، کہانیاں، لوک گیت یہ سب ہمارا ثقافتی ورثہ ہے۔ ہر زبان و ادب کی اپنی تہذیب و ثقافت ہوتی ہے جس میں وہ سانس لیتا ہے۔ اگر اسے اسی نظام کا زائدہ تصور کریں تو اس کی اہمیت از خود واضح ہو جاتی ہے اور اس کی ساری خصوصیات نمایاں ہو کر نظر آنے لگتی ہیں۔ وہاب اشرفی لکھتے ہیں:

''تب ہمیں اپنی غزل نیم وحشی ہرگز نہیں معلوم ہوگی، ہمارا محبوب، زندگی سے عاری نظر نہیں آئے گا، فراق و وصل کی کیفیت بے معنی نہیں ٹھہرے گی۔ ہماری تشبیہیں، استعارے اور ہماری دوسرے بلاغت اور عروضی نظام بیکار محض ہیں، نہ معلوم ہوں گے اور یہ بھی احساس ہوگا کہ سنسکرت بھی تو ہماری وراثت تھی، تو اس سے فائدہ ہم نے کیوں نہیں اُٹھایا، اس کے رسوں کے نظام پر

ہماری توجہ کیوں نہیں گئی، یعنی ہم نے اپنی مٹی ہی کی خبر نہیں رکھی اور ظاہر ہے
اسی مٹی نے ہمارا خمیر مرتب کیا ہے۔'' (۲۲)

متذکرہ بالا مضمرات وممکنات کی روشنی میں مجموعی جائزہ لیا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ آزادی کے بعد بھی ہم ذہنی طور پر انگریزوں کے غلام ہیں۔ انگریز یہاں کے لوگوں کو ذہنی، سیاسی، سماجی، نظریاتی، ادبی، ثقافتی اور مذہبی طور پر کھوکھلا کر گئے ہیں۔ اب انھیں ان کی غلامی سے باہر نکل کر مقامی روایت وتہذیب کی بات کرنا ہوگی۔

☆☆☆☆☆

مصادر ومراجع

(۱) مولانا سیدابوالاعلیٰ مودودیؒ، تنقیحات۔ص ۱۱، ۲۰۰۹ء، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی

(۲) ایضاً

(۳) ایضاً۔ص ۱۶۔۱۵

(۴) ڈاکٹر عبدالباری، بیسویں صدی کے اردو ادب کا جائزہ۔ص ۱۳۰۔ ۲۰۱۱ء، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

(۵) *Edward Syed 1978 "Orientalism" pg.107 Vintage Books, USA*

(۶) ماہنامہ اردو دنیا جنوری، ۲۰۱۴ء، ص ۵۸، نئی دہلی

(۷) *POST-COLONIALSIM, A Guide for the preplexed, Pg.1 by Pramod K.Nayar*

(۸) ابولکلام قاسمی، معاصر تنقیدی رویے، ص ۶۴، ۲۰۰۷ء، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ

(۹) ماہنامہ اردو دنیا جنوری، ۲۰۱۴ء، ص ۵۷، نئی دہلی

(۱۰) عبادت بریلوی، اردو تنقید کا ارتقاء، ص ۳۰۱، ۲۰۰۴ء، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

(۱۱) ششماہی فکر وتحقیق (جنوری تا جون ۱۹۹۸ء)، مدیر حمید اللہ بھٹ، نئی دہلی

(۱۲) ڈاکٹر نفیس بانو، تہذیب الاخلاق۔ تحقیقی وتنقیدی مطالعہ۔ص ۱۱۱، ۱۹۹۳ء، نشاط آفسیٹ پریس، فیض آباد

(۱۳) *Edward Syed 1978 "Orientalism pg.350 Vintage Books, USA*

(۱۴) وہاب اشرفی، مابعد جدیدیت مضمرات وممکنات۔ص ۱۱۲، ۲۰۰۵ء، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی

(۱۵) ایضاً ۔ص ۱۰۸

(۱۶) ایضاً ۔ص ۱۱۵

(۱۷) *Ania Loomba1993 "Culture and Imperialism" Pg.246 Vintage Books, USA*

(۱۸) گوپی چند نارنگ ،اردو مابعد جدیدیت پر مکالمہ ۔ص ۴۷ ، ۱۹۹۸ء، اردو اکادمی دھلی

(۱۹) گوپی چند نارنگ ، (مقالہ)مابعد جدیدیت ،مغرب اور مشرق میں مکالمہ (مشمولہ) اردو مابعد جدیدیت پر مکالمہ ۔ص ۱۱۰ ۔۱۱۱ ۔۱۹۹۸ء، اردو اکادمی دھلی

(۲۰) شمس الرحمٰن فاروقی ،شعر شور انگیز ۔ص ۱۰-۹ ، ۲۰۰۶ء، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی ص ۹ ۔۱۰

(۲۱) ایضاً ۔ص ۲۰

(۲۲) وہاب اشرفی ، مابعد جدیدیت مضمرات وممکنات ۔ص ۴۳۷ ، ۲۰۰۵ء، مکتبہ جامع لمیٹڈ ،نئی دہلی

❁ ❁ ❁